

اپنی مخصوص کپسیں اڑا رہے تھے کہ ٹیلی ویژن کیسرے کی ٹرالی ہماری طرف پکی۔ ہم سب نے اپنی اپنی ٹائیاں درست کیں، کارلوں کے کان سیدھے کیے اور ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھنے لگا۔ جو نہیں کیسرے کا گوشہ چشم ہماری طرف منعطف ہوا۔ میں نے جھٹ سے اپنی قراقلی گود سے اٹھا کر سر پر کھلی۔ کو منزہی دینے والے نے یونیورسٹی کے صاحب رسمات سے میری بابت پوچھا اور مائیک پر اس کی گفتگو کا سلسلہ پاکستان کے ٹوکیوں، بنگال کے شیر کپنگ کے کم اور زمزد سے جاملا۔ فیرا کوئی نے اپنی مرغوب فارسی ترکیب استعمال کرتے ہوئے بادسالی سے کہا۔ ”یہ پر سوختہ بڑا چالاک ہے۔“

بادسالی نے ٹوکیاں طوطے کی طرح سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”درایں چہ شک“ اور میں نے بات کارخ جلدی سے دی پتیر و کی طرف پھیر دیا۔ ابھی ہم اس نازک مرحلے پر پہنچنے بھی نہ پائے تھے جس سے دی پتیر و چوتا تھا کہ ہماری میز پر یونیورسٹی کے ریکٹر صاحب آگئے۔ ہمیں اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اٹھنا پڑا۔ ریکٹر صاحب نے ہمیں ہاتھ کے اشارے سے اور فیرا کوئی کو بازوؤں سے کپڑا کر بھاتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”ذر امیرے ساتھ چیلے ستاتی کانوالی خاندان آپ سے ملنے کا متنی ہے۔“ میرے بھاگ جاگ اٹھے۔ قراقلی کو پھونک مار کر اور ٹائی کی گردہ ایک مرتبہ پھر جھاڑ کر میں نے کہا۔ ”چلیے!“

بادسالی نے آہستہ سے کہا۔ ”بہتر نگے کہ خواہی جامدی پوش۔“

”فیرا کوئی بولا۔“ ”پر سوختہ۔“

اور میں ریکٹر صاحب کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

اطلس و کخواب منڈھی کر سیوں پر ایک دائرے میں نوابی خاندان فروکش تھا۔ وسطیٰ کرسی پر پیچا س پچپن برس کی ایک بڑھیا جلوہ افروز تھیں۔ ان کے سر پر سرخ محمل کی ٹوپی بائیں کان اور کنٹی کو اپنی لٹک میں چھپائے تھی اور ناک کی خمیدہ چونچ اوپر کا ہونٹ چھوڑی تھی۔ اطلس و کخواب اور سنہری گوٹ سے بھی ہوئی آبنوسی کرسی میں نواب بیگم کڑک لیگ بارن کی طرح بیٹھی تھیں اور ان کے سکریٹ سے وابستہ راکھ کی لمبی سنواری ہوئی کو نپل گرنے ہی والی تھی۔ ریکٹر صاحب نے ذرا سے ایک طرف ہو کر ہاتھ کے ایک لطیف اشارے سے کہا۔ ”سو آتیچ لینسا بار و نیتا ستاتی۔“

میں نے ایڑی ملائی، پنج جوڑے، بیاں ہاتھ پہلو سے لگا کرنے والے درجے کا زاویہ بتایا۔ بڑی کوشش سے آواز میں جگنو بھر کر ”اونور اتو!“ کہا اور نواب بیگم کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر پشت دست سے کوئی ایک اچھے اور لبوب کی ہولے سے چکلی بجائی اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

ریکٹر صاحب نے ہاتھ سے پھر ویسا ہی اشارہ کیا۔ ”کیاریسما سینور نیا ماریا ستاتالی۔“

میں پھر جھکا اور اب کے میرے ہونٹ پشت دست سے کوئی ادھ اچھے اور پر رہے۔ اشارہ ہوا میں پھر لہرایا۔ ”کیاریسما سینور نیا آتا۔“

جب کیاریسما آنا کے ہاتھ سے میرے لب چھوئے تو کیاریسما سینور نیا ماریا نے گوشہ چشم سے دیکھا۔

ریکٹر صاحب نے کہا۔ ”سوالی پچھے لینے بارو نے ستاتالی۔“

اب کے میرے جسم نے کچھ ایسا ختم نہ کھایا اور میں نے ہاتھ کو ایک ہلکا سا جھکا دے کر ”اونور اتو!“ کہا اور مسکرانے کی کوشش کی۔

ریکٹر صاحب نے کہا۔ ”مالیستر و ستاتالی۔“

اب گویا میں خم ٹھونک کے کھڑا ہو گیا اور گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر کہا۔ ”آں شانتے۔“ اتنے میں نواب بیگم کے سگریٹ کی راکھ ان کے سکرٹ پر گرگئی اور سب اپنے اپنے رومال نکال کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے اپنارومال جیب سے نکالنا اس لیے مناسب نہ سمجھا کہ وہ جگہ جگہ سے چپکا ہوا تھا۔

ریکٹر صاحب مجھے بٹھا کر اور معدتر طلب کر کے چلے گئے۔ باقی شروع ہوئیں اور بازو نیتا ستاتالی نے بڑے مر بیانہ انداز میں پوچھا۔ ”کیاریسما پروفیسور نے وطن چھوڑے کتنی مدت ہوئی ہے؟“

”کوئی ڈیڑھ سال۔“ میں نے جی ہی میں ہاتھ باندھتے ہوئے عرض کی۔

”رومپند آیا؟“ حضور بارو نے پوچھا۔

”جی بہت۔“

”کب تک اور نہہر نے کا ارادہ ہے؟“

”حضور دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔“ میں نے خالص مشرقی انداز میں کہا۔
”دیکھا اتی۔“ کیا ریسمان سینور نیا ماریا نے کہا۔ ”مشرق کے لوگ بڑے خدا
پرست ہوتے ہیں اور ہر چیز مجانب اللہ لصور کرتے ہیں۔“

”مگر یہ دانے دانے پر مہر کا کیا مطلب؟“ سینور بارو نے پوچھا۔

”حضور۔“ میں نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ”انج کا ہر وہ دانہ جو ہم کھاتے ہیں،
ہمارے نام اور پتہ کا حامل ہوتا ہے۔ ہم نہ اس سے زیادہ کھا سکتے ہیں نہ کم۔“

”مگر ہمیں تو کوئی مہر دکھائی نہیں دیتی۔“ چھوٹے مائستر نے حیران ہو کر
کہا۔

”جناب اس کے لیے صوفی کا دل اور یوگی کی آنکھ چاہیے۔ اور اگر—“
مگر سینور بارو نے میری بات کاٹ دی اور مسکرا کر پوچھا۔ ”پروفیسووٹ
آپ بھی یوگا جانتے ہیں؟“

”جی کیوں نہیں۔“ میں نے سر جھکا کر عاجزی سے جواب دیا۔
”کر کے دکھاؤ۔“ مائستر وہے تاب ہو گیا۔

”ہوں ہوں۔“ سینورنا آنانے تاو بھی نگاہوں سے گھورا۔ اور میں خاموش ہو
کے رہ گیا!

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ جناب بارو را کھ دان میں پائپ جہاڑتے ہوئے
bole۔ ”ہمیں بھی نوابی خدا، ہی کی طرف سے ملی تھی۔“

”تھی کیوں؟ ہے!“ تینوں ماں بیٹیاں یک زبان ہو کر بولیں اور نواب صاحب
چپ ہو گئے۔

”کوئی ایک دو سال تو اور ٹھہریے گا۔“ نواب بیگم نے بات کا رخ بدلا۔
”شاید اس سے بھی زیادہ۔“ میں نے امید ظاہر کی اور ساتھ ہی انگلی اور اٹھا کر
کہا۔ ”سب اس کے اختیار میں ہے۔“

سینور نیا ماریا نے کہا۔ ”کے۔ نوکی چوٹی فتح ہو جانے پر ہم نے آپ کے ملک
کی بابت بہت کچھ پڑھا ہے۔ کبھی ہمارے محل میں آ کر ہمیں کچھ اور بتائیے۔“

”جی ضرور۔“ میں نے آنکی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو میری عین خوش

تمتی ہے کہ آپ چیسے۔ ”
”اوہ ہو کوئی بات نہیں۔ ”نواب صاحب نے کہا۔ ”یہ تو آپ کی ذرہ نوازی
ہے۔ ”

اس کے بعد ادھر ادھر کی اور باتیں ہوتی رہیں اور پھر میں اگلے ہفتے ان کی
خدمت میں حاضر ہونے کا وعدہ کر کے واپس اپنی نشست پر پہنچ گیا۔
”پدر سوختے۔ ”فیراکوتی نے حسبِ معمول میرا استقبال کیا۔
باوسانی نے جدید فارسی میں ایک اور گالی دی جس کا مطلب میں ٹھیک سے
سمجھنا سکا۔

رات بھر اس شدت سے ژالہ باری ہوتی رہی کہ میں نے اگلے دن یونیورسٹی
جانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔ تیرے سال کے ایک صاحبزادے انہی دنوں منشو کی کہانی
پڑھتے کلمہ لا الہ کا ترجمہ کر رہے تھے۔ انہوں نے خدا جانے کیسے میری نیت بھانپ کر
ٹیلی فون کیا کہ اگر یونیورسٹی جانے میں کوئی دقت ہو تو میں موڑ لے کر پہنچ جاؤ۔
آخری چار صفحے رہ گئے ہیں آج سمیت لیں گے۔ اس کی لگن سے مجبور ہو کر میں نے ہامی
بھر لی اور گیارہ بجے کے قریب چھینٹے اڑاتی موڑ میں سوار ہو کر ہم یونیورسٹی پہنچ گئے۔
کوئی ایک گھنٹہ میں ترجمہ مکمل ہو گیا تو میں نے گھر جانے کے بجائے کلاس روم ہی میں
بیٹھ کر اب ایجاد کے نام ایک خط لکھنا شروع کیا۔ کس طرح میزی ایک نواب صاحب سے
ملاقات ہوئی۔ کیسی کیسی علمی اور ادبی باتیں ہوا کیں اور کس خوشامد سے انہوں نے مجھے
اپنے محل آنے کی دعوت دی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ خط خاندان کے ایک ایک کنبہ میں
بڑے فخر سے نایا جائے گا۔ ہمارے سرانے اور خاندان کے دیگر افراد کے درمیان نئے
سرے سے فاصلے متعین کیے جائیں گے اور چوبرجی کو اثر کے گلرک لا لیقوب کو
ہمیں اپنارشتہ دار تسلیم کرنے سے معدود ری ظاہر کرنا پڑے گی۔

میں ابھی یہ خط لکھ بی ربا تھا کہ دروازے پر بلکے سے دستک ہوئی۔
”آئیے۔ ”میں نے کاغذ سے نگاہیں اٹھائے بغیر کہا اور دروازے کی چھیلتی ہوئی جھری
میں سے بھڑاندر داخل ہوئی۔ اسے اپنے سامنے اس طرح یونیورسٹی کے شعبہ شریقات
میں دکیجہ کر میری روح فتا ہو گئی۔ اس نے بڑے شوخ بنتی رنگ کی برساتی پہن رکھی

تھی۔ اسی رنگ اور اسی کپڑے کی چھوٹے کناروں والی نوپی تھی اور ہاتھ میں سیاہ آبنوس کے لبے دستے والی سلیٹی چھتری تھی۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”میرے اس طرح یہاں چلے آنے پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟“

میں نے جمل کر کہا۔ ”ہے کیوں نہیں! ایک تو آپ میری اجازت کے بغیر یہاں تشریف لے آئی ہیں۔ دوسرے آشناوں کے انداز میں تم کہہ کر مناطب کر رہی ہیں۔ تشریف لے جائیے۔“

اس نے میز کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”باہر بلا کی بارش ہو رہی ہے۔ آج آپ موڑ بھی نہیں لائے۔ پاس نہ چھتری ہے نہ برساتی۔ ٹرام تک پہنچنے پہنچنے بالکل بھیگ جائے گا۔“

میں نے چڑ کر کہا۔ ”آپ کی مہربانی کا شکریہ۔ میں آج شام تک یہیں رہوں گا اور شام تک بارش تھم جائے گی۔ آپ تشریف لے جائیں۔“

اس نے چھتری کا ہینڈل ہاتھ میں گھماتے ہوئے کہا۔ ”یہ اطالوی بارش ہے۔ شام تو کیا صبح تک نہ تھے گی۔ میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔“

”لیکن مجھے آپ کی مدد کی ضرورت نہیں۔“ میں نے چلا کر کہا۔ ”آپ تشریف لے جائیں۔“

بھڑد بے پاؤں دروازے کے شنگاف سے باہر نکل گئی اور میں وو تین منٹ تک الٹی سیدھی باتمیں سوچتا رہا۔ پھر خط لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ خط لکھ کر میں نے پن بند کیا۔ لفافہ جیب میں ڈالا اور اپنے کمرے کی سیڑھیاں اتر کر نیچے ہال میں چلا گیا۔ باہر دھڑلے کا یمنہ برس رہا تھا۔ ٹیوڑھی چھوڑنے سے پہلے میں ایک مرتبہ جھوکا، پھر کوٹ کے کالر اور اٹھائے اور برستی دھاروں میں باہر نکل گیا۔ دس قدم کے اندر اندر میرا سر کندھے اور آستینیں ساری بھیگ گئیں اور پھر جیسے ایک دم میرے سر پر بارش نے اپنا نزول بند کر دیا۔ میں نے زگاہ اور اٹھائی توسرے ایک فٹ اونچا سلیٹی رنگ کاریشمی ہالا میرے اوپر چلا آرہا تھا۔ میں نے چور زگاہوں سے پیچھے دیکھا تو اس نے پوچھا۔ ”مجھ سے ناراض ہیں؟“

میں نے بھٹا کر کہا۔ ”یہ کیا حماقت ہے۔ آخر تم مجھے اپنی راہ کیوں نہیں چلنے دیتی ہو۔“

اس نے ہولے سے جواب دیا۔ ”آپ اپنی راہ پر ہی تو جا رہے ہیں۔“

”مگر تم میرے پیچھے کیوں آرہی ہو؟“ میں نے کھنچ کر کہا۔

”اس لیے کہ میری راہ بھی یہی ہے۔“

میں خاموش ہو گیا اور جب ہم سائیکالوں جی ڈی پارٹمنٹ کے سامنے سے گزرے تو فیرا کوتی برآمدے میں کھڑا اپنی برساتی کی پیٹی باندھ رہا تھا۔ مجھے اس طرح جاتے دیکھ کر اس نے زور کا نعرہ لگایا Bravo پر سوختہ Bravo اور میں ہاتھ کی جھنڈی ہلاتا مسکراتا آرام سے گزر گیا۔

”مجھ سے ناراض ہیں؟“ اس نے پھر پوچھا۔

اور میں نے جان چھڑانے کو کہہ دیا۔ ”نہیں۔“

”تو پھر میں تمہارا بازو تھام لوں؟“

میں خاموش رہا اور اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔

جس دن میں نواب صاحب کے محل جا رہا تھا۔ ایل ویرا میرے کمرے میں میرے سب سے قیمتی سوٹ کوپانی کے تریڑے دے کر بڑے انہاک سے استری کر رہی تھی۔ شیو بناتے بناتے میں نے ایل ویرا کی طرف دیکھا اور ایک آنکھ میچ کر پوچھا۔ ”ایل ویرا سوٹ استری کرنے کے بھی دو ہزار لیرے لوگی یا کم؟“ اس نے استری شینڈ پر رکھ کر میری طرف دیکھا اور پھر پتلون کے بل سیدھے کرنے لگی۔ چوہئے کی طرف نظر اٹھا کر اس نے ہولے سے پوچھا۔ ”سخت گرم میانی سے منہ دھوؤ گے یا نیم گرم سے؟“

میں نے کہا۔ ”جیسا بھی مل جائے۔“ اور اس نے گیس بند کر دی۔

اس اشنا میں وطن سے ابا جان کا جواب آگیا تھا کہ وہ میرے نئے تعلقات سے بہت خوش ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ اطالیا کے دیگر اعلیٰ خاندانوں اور برتر نسل کے لوگوں سے ابھی میرے روابط اور استوار ہوں گے۔ ابا جان نے لکھا تھا کہ بڑے سوچ چمار کے بعد انہوں نے سنت نگر میں میری نسبت توڑوی تھی کیونکہ اس شادی سے

ہمیں کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ رہا تھا۔ اب وہ ایسے آدمی کی تلاش میں تھے جو حکومت کے کسی بھی بڑے ملکے میں پرست آفیسر ہوتا کہ اس کی بدولت ہمیں بھی سرکاری فائدہ پہنچ سکے۔

سو اپنے لینسا کے محل میں داخل ہوتے ہی پہلے دربان نے مجھے فرشی سلام کیا۔ اس کے بعد برآمدے کے گلر کے اندر ٹیلی فون کیا۔ سفیدوردی میں ملبوس ایک خدمت گار برآمدہ ہوا۔ اس نے بڑی منجھی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ گیلری کے آخری کونے پر ایک نو عمر بڑی کی نے میری ٹوپی اور کوٹ لیا اور ایک بڑھی دایہ کے ساتھ میں ڈرائیکٹ روم میں داخل ہوا۔ نواب بیگم اور ان کی دونوں صاحجز ادیاں صوفوں پر نیم دراز تھیں۔ میں نے بڑے تپاک سے رسم دست بوسی ادا کی اور بڑی احتیاط سے ایک کرہی پر بیٹھ گیا۔

کیا ریسما سنوری ناماریا نے پوچھا۔ ”آپ کے ملک میں ادبی مجالس بھی ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”جی بے شمار۔“

وہ صوفے پر سنجھل کے بیٹھ گئیں اور پوچھنے لگیں۔ ”آپ کے ادب کے کون کون سے مسائل ہیں؟“

میں نے عرض کیا۔ ”ہمارے ادب کے چند تمدنی مسائل ہیں اور چند جدیاتی۔“

میرے اس جواب سے وہ بہت متاثر ہو گئیں اور کیا ریسما آنا کی طرف دیکھ کر بولیں۔ ”ادب کے اظہار سے متعلق آپ کے ادیبوں نے کس قسم کے تجربے کیے ہیں؟“

میں پٹھا گیا اور گلاصاف کر کے بولا۔ ”ہمارا ادب صوتی اعتبار سے دنیا کا ایک ہی ادب ہے۔ ہماری زبان میں کوئی بھی لفظ ایسا نہیں جو صوتی اعتبار سے اسم کی ترجمانی نہ کرتا ہو۔ مثلاً ہاتھی لیجھے۔ تھہ پکارنے کے لیے جب زبان کی نوک اوپر کے تالوں نے لگتی ہے تو ایک قسم کی گھمیرتا ایک قسم کی ہیئت اور ایک طرح کے خوف کا احساس ہوتا ہے۔ دیکھئے ہاتھی! ایلی فانتے میں وہ بات نہیں ہے۔“

نواب بیگم نے پوچھا۔ ”گینڈے کو آپ کیا کہتے ہیں؟“
میں نے قدرے لرز کر کہا۔ ”تحالی!— دیکھئے تھے پہلے آجائے کی وجہ سے
اس میں اور بھی کرتگی پیدا ہو گئی ہے۔“

آنانے مرعوب ہو کر پوچھا۔ ”چیونٹی کو آپ کی زبان میں کیا کہتے ہیں؟“
”کیری۔“ میں نے ہونٹ بلائے بغیر جواب دیا۔
اور تینوں یک زبان ہو کر بولیں۔ ”کیری۔“

”اب دیکھئے۔“ میں نے ماہر لسانیات کی طرح کہا۔ ”یہ لفظ آدمی کے منہ سے
یوں نکل جاتا ہے جیسے مداری کے مند سے جادو کا فیت۔ اس میں ایک طرح کا چھوٹا پن
ایک طرح کی کمزوری اور ایک انداز کی مفعولیت پہنچا ہے۔“

وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر کیری کیری کرنے لگیں۔ نواب بیگم
نے پوچھا۔ ”پروفیسورے آپ کو یورپی گانے والوں میں سے کون سب سے زیادہ پسند
ہے؟“

مجھے ایک پال رہسن کا نام یاد تھا مگر وہ سمجھت کالا جبشی تھا اور اس کا نام اس
محفل میں لیا جانا میری اور اس خاندان دونوں کی بے عزتی تھی۔ میں نے قدرے تامل
سے بعد کہا۔ ”پنجا مینو جیل اور— اور—“
”بس بس۔“ آنانے خوش ہو کر کہا۔ ”دیکھا امی غیر ملکی بھی اسی کو پسند کرتے
ہیں۔“

سینورینا ماریانے اور اسی پر یادوනا کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہا تو میں نے
عرض کیا۔ ”اس سلسلے میں تو یونان کی گانے والیاں سب سے اول ہیں۔“ صلاح یہ
ٹھہری کہ اگلے ہفتہ اپرا جانا چاہیے۔ میں سلام کر کے ٹوپی اور اور کوٹ لے کر گھر
وہاپس آگیا۔

اپنے کمرے کے کونے میں سر نیہوڑائے میں ریڈ یو سکرپٹ لکھ رہا ہوں۔ ایں
ویرا اویوان پر بیٹھی پرانی جراییں رفو کر رہی ہے کہ اچاک اس نے سوئی روک کر پوچھا
”ایشے گک دنیا گول ہے نا؟“
”ہوں۔“ میں نے دیے ہیں لکھتے لکھتے جواب دیا۔

”تو پھر جو لوگ نیچے رہتے ہیں، وہ گر کیوں نہیں جانتے؟“
 میں نے چڑ کر کہا۔ ”تم کوئی دوہزار لیرے کی بات کرو۔ کوئی تھانے تحصیل کی
 دھمکی دو، یہ باتیں تمہارے سمجھنے کی نہیں۔“

وہ خاموشی سے پھر رونگر کرنے لگتی۔ ایں ویراکی موجودگی کا ایک فائدہ بھی تھا
 اور وہ یہ کہ جب بھی مجھے کسی لفظ کے معنی نہ آتے تو اس سے پوچھ لیتا۔ معنی بتا کر وہ اس
 قدر خوش ہوتی جیسے ہفت اقلیم کی پادشاہت مل گئی ہو لیکن میری اور اس کی یہ ملاقاتیں
 بس میرے کمرے تک ہی محدود تھیں۔ باہر اس کے ساتھ نکلنا میں گوارانہ کرتا تھا اور
 بھی سر را ہے اچانک ملاقات ہو جانے پر وہ خود کئی کاٹ جایا کرتی تھی۔ اس کی ایک تمنا
 سے میں بخوبی واقف تھا اور وہ یہ کہ کسی دن ہم اکٹھے تھیز یا سینا چلیں مگر ایک طوائف
 کے ساتھ کھلے بندوں یوں گھومنا کسی شریف آدمی کو کب پرند آتا ہے بھلا۔ میں نے
 صاف لفظوں میں اس سے کہہ دیا کہ اس کی تمنا نہ رکھے اور کوئی اور گھر تلاش کرے۔
 ایک مرتبہ میلان کا مشہور سرکس ”چر کو تونی“ روما آیا تو اس نے تجویز پیش کی کہ ہم اچھے
 خاصے طویل و قفقے کے بعد گھر سے چلیں اور ایک دوسرے کے پیچھے سرکس پہنچ جائیں۔
 باسکس پہلے سے مخصوص کروالیں گے اور کوئی ہمیں دیکھنے والا نہ ہو گا مگر میں نے اس کی
 یہ تجویز بھی رد کر دی اور سرکس ایک مہینہ بعد واپس چلا گیا!

اماں کا خط آیا کہ تمہارے باہنے ایک پرمٹ آفیسر ڈھونڈتا تھا۔ میں لڑکی
 بھی جا کر دیکھ آئی تھی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ افسرا ایک سال کے اندر اندر میٹاڑ
 ہونے والا ہے۔ اس لیے ارادہ ترک کر دیا مگر تلاش جاری ہے۔

محل کے اندر اور باہر کیا رسماں سینورینا ماریا سے میری ملاقاتیں بہت بڑھ گئی
 تھیں اور اب مجھے ماریا کے سوا اور کچھ دکھائی ہی نہ دیتا تھا۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر اگر
 کوئی تھنہ خریدتا بھی تو ایں ویراہی اس کا پارسل بناتی اور وہی اسے ڈاک خانے لے جا کر
 سپر دڈاک بھی کرتی۔ ایں ویراہی سے میں نے اپک رومال پر چائے رنگی پتیوں کا پھول
 کڑھوا کر ماریا کو دیا تھا کہ یہ ہمارے ملک کی صنعت کا ایک نادر نمونہ ہے۔ کچھ پیسے ایں
 ویراہی سے لے کر اور کچھ اپنی جیب سے ڈال کر میں نے پرانی اشیاء فروخت کرنے والے
 سے تابہ کی کئی صد سالہ ایک چھوٹی سی ڈیا خریدی تھی اور اسے ماریا کی خدمت میں یہ

کہہ کر گزارا تھا کہ موہنبو داڑو کی کھدائی سے نکلی تھی اور ہمارے خاندان میں اس وقت سے چلی آرہی تھی۔ جب میرے آب و جد سندھ کے حاکم تھے۔ ذیا خریدنے کے لیے ایل ویرا نے اتنی بڑی رقم مجھے اس شرط پر دی تھی کہ ایک دن ہم اکٹھے پک بک پر چلیں گے۔

وقت مقررہ پہنچنے پر گو میرا سارا وجود کا پئنے لگا تھا، تاہم میں وعدے سے انحراف نہ کر سکا۔ جب روما کی سرحد ختم ہو گئی اور دوئے پونتی گاؤں کی حدود میں داخل ہونے لگے تو میں نے بریک لگادی اور ایل ویرا سے کہا۔ ”ہم آگے نہیں جائیں گے۔“

”کیوں آخر؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اس لیے کہ روما کی حدیہاں ختم ہو جاتی ہیں اور آگے دوئے پونتی کا نیا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔“

ایل ویرا کانوں تک سرخ ہو گئی اور شرا کر اس نے سر جھکالیا۔ میں نے موڑ شارٹ کر کے روما کی طرف موڑنا چاہی تو اس نے سٹریمگ پکڑ کر دوئے پونتی کی طرف کاٹنا شروع کر دیا۔

میں نے زور سے اس کی کلاں پر ہاتھ مارا تو اب کے اس کا سکھ گھوم کر میری پشت دست پر نہ لگا کیونکہ اب اس کی کلاں میں وہ زنجیر ہی نہ تھی۔ دوئے پونتی سے ذرا آگے نکل کر ہم نے ایک سر بزیٹیلے کے پہلو میں موڑ رک لی۔ کھانے پینے کی چیزیں نکالیں اور میں چوٹی پر جا کر بیٹھ گئی۔ نیچے سے گاڑی گزرتی تھی اور پرے ایک برساتی نالہ بل کھا رہا تھا۔ شہر سے دور یہاں پہنچ کر جہاں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا، میں ایک بار پھر ایل ویرا سے بیگانوں کی سی باتیں کرنے لگا۔ اس نے میرے کوٹ کی آٹیں پر چکنائی کے داغ کو ناخن سے کھرپتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہیں مارنیا سے بہت زیادہ محبت ہے!“

میں نے کہا۔ ”بس اسی قدر کہ گزشتہ زمانوں سے لے کر اب تک کی ساری محبتیں سمجھا ہو جائیں تو ہماری محبت کا ایک پہلو واضح ہو۔“

”تم اس سے شادی کرو گے؟“ ایل ویرا نے پوچھا۔

”خواہ میری راہ میں تابنے کے تپتے ہوئے پہاڑ اور شعلوں کی ندیاں آجائیں تو بھی۔“

اس نے کہا۔ ”پھر تمہیں مہمانوں کے کوٹ اور ٹوپیاں پکڑنے کو ایک لڑکی کی توضیح دیتی ہو گئی؟“

میں نے کہا ”کیوں نہیں۔“ اور ساتھ ہی اس کی ناک پکڑ کر کہا۔ ”تم طوائف لوگ بھی بڑی ذہین ہوتی ہو۔“

اس نے فوراً میری آسمیں چھوڑ دی۔

گاؤں کے کچھ بچے ہماری موڑ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے تھے اور شیشون میں سے اندر جھانک رہے تھے۔ میں نے سیٹی بجا کر انہیں اوپر پہاڑی پر بلایا۔ کچھ میٹھی گولیاں اور نافیاں ان کی نذر کیں اور باقیں کرنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں بچے ہم سے مانوس ہو گئے اور میں نے اپنے مفلر کو بل دے کر انہیں کوٹلہ چھپا کی کاکھیل سکھانا شروع کیا۔ سب ایک دائرہ باندھ کر بینٹھ گئے اور میں کوٹ کے بیچے کوٹلہ چھپا کے ان کے گرد چکر لگانے لگا۔ کوٹلہ ایل ویرا کے پیچھے پھینک کر میں نے جلدی سے اپنا چکر ختم کیا اور پھر دھڑا دھڑا س کی کمر پر کوڑوں کی بارش کر دی۔ وہ اوئی کر کے اٹھی، پھر زور سے ہنسی اور ہڑ بڑا کر شور مچاتی بھاگنے لگی۔ سب بچے تالیاں پینٹنے لگے اور ہم ہنس کے بے حال ہو گئے۔ اس کے بعد شہسواروں کی لڑائیاں شروع ہوئیں۔ ماریو ایل ویرا کے کندھوں پر چڑھا اور جینا میری گردن پر سوار ہوئی۔ ماریو جب بھی زور کا وار کرتا، جینا میرے پال پکڑ لیتی۔ دو تین واروں سے میری آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ جینا شور مچا رہی تھی۔ گھوڑے شاباش گھوڑے شاباش، ایل ویرا اندرے مار رہی تھی۔ شاباش سوار زندہ باد سوار۔ میں نے اپنی زد پتی دیکھی تو کندہ امار کر ایل ویرا کو گرا دیا۔ میدان ہمارے ہاتھ رہا۔ وی داسینور پاکستانوں داسینور پاکستانوں کے نعروں سے رن کاپنے لگا۔

اگلے دن مجھے بڑے بھائی کا خط ملا کہ ملک کے دو بڑے حصے بنادینے کا فیصلہ کیا جا رہا ہے، جلدی پہنچنے کی کوشش کرو۔ تمہیں ایک اچھی سی نوکری ملنے کی امید ہے۔ ہم نے مولوی غلام رسول کی معرفت سعادت یار خاں کے ہاں رشتہ کا پیغام بھجوادیا ہے۔ اس طرح لاہور میں مستقل ہو جانے کی قوی امید ہے۔ جلد آنے کی کوشش کرو۔ میں جلد آنے کی کوشش تو اس وقت کرتا جب ماریا میری محبت کا جواب

سرد مہری سے دیتی۔ وہ میرے تجھر علمی پر مٹی ہوئی تھی اور میں پاکٹ انسائیکلو پیڈیا لمحہ بھر کو اپنے پہلو سے جدانہ کرتا تھا۔ کیا ریسما آنا کو ہماری محبت کا علم ہو چکا تھا اور وہ خدا جانے کیوں جل بجھی جاتی تھی۔ انہی دنوں روم یونیورسٹی کے ساتھ میرا معابدہ ختم ہو رہا تھا اور میں نئے معابدے کی فکر میں تھا مگر بات بفتی نظر نہ آتی تھی۔ ایل ویرا مغموم رہنے لگی تھی کیونکہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے معابدہ کی اب تجدید نہ ہو گی۔ ماریا پریشان تھی کیونکہ آنا نے سوال اپے لینسا بار و نیسا کو بتایا تھا کہ میں دراصل کیتھولک نہیں ہوں۔ نواب صاحب قبلہ اور نواب بیگم صاحبہ کچھ اس خلوص کے ساتھ میرا سوآگت نہ کرتے تھے۔ اب نہ دروازے پر کوئی مجھے لینے آتا نہ چھوڑتے ہوئے فرشی سلام کرتا۔ لے دے کے ایک ماریا کی محبت تھی جو دامنِ دل کھینچ رہی تھی۔ میرے گھر میں ایل ویرا کے بڑھتے ہوئے اوقات مجھے اور پریشان کر رہے تھے اور مجھے اس یگانگت اور آشنای سے سخت نفرت ہو رہی تھی۔ کاجل کی کوٹھڑی میں دھبہ کا دھڑکا ہر وقت لگا رہتا۔

جس دن یونیورسٹی کی طرف سے ایک بڑے سے لفافے میں مجھے جہاز کا نکٹ اور میری خدمات کے جواب میں شکریہ کی ایک طویل چھپی موصول ہوئی، میرے پاؤں کی زمین نکل گئی۔ میں نے ٹیلی فون پر ماریا کو یہ دل دوز خبر سنائی تو اس نے شاید آنسو ضبط کر کے کہا۔ ”یہ دوریاں یہ فاصلے ہماری محبت کی راہ میں بال برابر بھی اہمیت نہیں رکھتے۔ تم فکر نہ کرو میں یہ رشتہ و پیوند توڑ کر حسین اطالیہ سے منہ موڑ کر اگلے ہی جہاز میں تمہارے پاس پہنچتی ہوں۔“ ٹیلی فون پر میری آواز بھرا گئی تو اس نے چمکار کر کہا۔ ”اُف خدا یا، مشرقی لوگ کیسے یاں پسند ہوتے ہیں۔ کبھی تو مصیبت کا ہماری طرح مردانہ وار مقابلہ کیا کرو۔“ مگر اس کی باتوں سے میرے آنسو ضبط نہ ہو سکے۔ ایل ویرا کو کتابیں ٹھیک کرتے سامان باندھتے ہوئے دیکھتا تو اتنی تسلی ضرور ہوتی کہ اب اس لعنت سے تونجات ملے گی۔

دریان کو پتہ چل گیا تھا۔ میشن کے لوگوں میں باتیں ہونے لگی تھیں۔ کچھ ایسی ولیکی خبریں یونیورسٹی میں بھی اڑنے لگی تھیں۔ خدا کا شکر ہے ان سے تونجات ملے گی۔ ان آخری لیام میں ایل ویرا نے بات کرنا بالکل ترک کر دیا تھا۔ اکثر کتابوں پر موسیٰ

کاغذ چڑھاتے چڑھاتے وہ تھک کر دیہیں دیوان پر سو جاتی۔ جب میں آدھی رات کے بعد ماریا کے ہاں سے لوٹتا تو اسے جھنجور کر جگاتا اور شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے جوتا پہنچتی، چھتری اٹھاتی اور نیم خوابی کے عالم میں باہر نکل جاتی۔

میرے روما چھوڑنے کا دن آپنچا۔ ایل ویرا نے کہا مجھے اپنے ساتھ نیپلز تک چلنے کی اجازت دو مگر میں نہ مانا کیونکہ ماریا اور آنا مجھے نیپلز کے ساحل پر الوداع کہنے آرہی تھیں۔ نواب صاحب نے تو کہا تھا کہ روما کے شیش پر ہی الوداع کہہ دی جائے مگر نواب بیگم نہ مانیں کہ روما کے شیش پر پروفیسوئے کے دوست یونیورسٹی کے چپراں دفتری اور محلہ کے لوگ وغیرہ الوداع کہنے آئیں گے اور وہاں ایسی بے ہنگام بحیرہ میں ہم شرفاء کا جانا ٹھیک نہیں۔ میں نے بھی اس کی تائید کی اور یہی مناسب سمجھا کہ نیپلز ہی ٹھیک ہے کیونکہ تخلیہ میں مستقبل کے پروگرام تو بن سکیں گے۔ گیارہ تاریخ گورات کے دس بجے میرا جہاز روانہ ہو رہا تھا اور میں اسی دن صحیح کے نوبجے روما سے نیپلز جا رہا تھا تاکہ دن بھر کشم وغیرہ کے ضوابط سے فارغ ہو کر ہورف پر ماریا اور آنا کا انتظار کر سکوں۔ جو شام کے پانچ بجے اپنی کار میں نیپلز پہنچ رہی تھیں۔

صحیح اپنے گھر سے روانہ ہوتے وقت میں نے رسی طور پر ایل ویرا کو گلے لگایا۔ اس نے دونوں بازوں میری کمر میں حائل کر دیئے اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے بات ثالثے ہوئے کہا۔ ”مجھے خط تو لکھا کرو گی نا؟“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اس کی کہنیاں پکڑ کر بازو علیحدہ کیے اور شیش پر آگیا۔ ٹکٹ لینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو مڑے تڑے ہزار ہزار لیرے کے دونوں میری جیب میں پڑے تھے۔ مجھے ایل ویرا کی حماقت پر بھسی آگئی۔

روم اور نیپلز کی شاہراہ پر آئے دن حادثات ہوتے ہیں اور نواب صاحب کا ذرا سیور سائھ ستر سے کم رفتار پر موڑ نہیں چلاتا۔ رات یک نونچ چکے تھے اور ماریا اور آنا کا پتہ نہ چلتا تھا۔ میں گینگ دے کے پاس کھڑا پریشان نظریوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور مسافر افراتفری کے عالم میں مجھے دھکے پر دھکا دیئے جا رہے تھے۔ اس دن یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وطن چھوٹ رہا ہوا اور جہاز کی نامعلوم مقام کی طرف لنگرا اٹھا نے

والا ہو۔ گینگ وے اٹھنے سے ذرا پہلے بارش شروع ہو گئی اور ہم سب مسافر جلدی جلدی عرشہ پر پہنچ گئے۔

ایک گز! دو گز! — تین گز!

جہاز نیپلز کے گھاٹ سے آہستہ آہستہ دور ہونے لگا۔ نیچے شید میں میں نے ماریا کی کار کا ہارن سن۔ مجھے یقین ہے وہ ماریا ہی کی کار تھی مگر اب جہاز دھیرے دھیرے رُخ بدلتا رہا تھا۔

بارش کی بوندیوں کے پیچھے بند رگاہ کی روشنیاں آنسو بن کر گلتی جا رہی تھیں۔

سامنے کریں کی اوٹ میں سے ایک سایہ آگے بڑھا اور ان بوندیوں کے درمیان ایتادہ ہو گیا۔ شوخ بستی رنگ کی برساتی۔ اسی رنگ اور کپڑے کے چھوٹے کناروں والی ٹوپی اور ہاتھ میں سیاہ آبنوш کے لمبے دستے والی سلیٹی چھتری۔

پیچھے ہٹ کر میں نے اپنے کوٹ کی بھیگی ہوئی آتین کو دیکھا اس میں سے فیکل فلاں اور پڑول کی بو آرہی تھی۔

